© rasailojaraid.com

۱۴ر اگست ۱۹۹۷ء اور قصہ نصف صدی کا

اورنگ زیب عالم گیر مغل حکومت کا آخری تاج دار تھا، جس کے دم سے حکومت اور معاشرے کا بھرم قائم تھا۔ اس کی مضبوط شخصیت اور آہنی ارادے نے زوال و انحطاط کی طاقتوں کو آگے بڑھنے سے روک دیا تھا۔ جونہی ۱۷۰۷ء میں اس کی آنکھیں بند ہوئیں، تو عالم گیر کے نالائق اور عیش پسند جاں نشینوں نے مرکز گریز طاقتوں کے سامنے ہتھیار ڈالنا شروع کر دیئے اور جدوجہد اور عزت و وقار کی زندگی پر ذلت و رسوائی کو ترجیح دی۔ ان باغی طاقتوں میں سب سے منظّم طاقت ایسٹ انڈیا کمپنی کی تھی، جس نے اپنی تجارتی لوٹ مار کے لیے میدان سیاست میں اترنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ چنانچہ وہ ایک "ٹھوس منصوبے" کے تحت مقامی سیاست میں اس حد تک چھا گئی تھی، کہ ۱۷۵۷ء میں پلاسی جنگ میں نواب سراج الدولہ کو کلائیو کے ہاتھوں شکست کا سامنا کرنا پڑا اور کلائیو نے اہل ہند کو بتایا کہ اب برصغیر کی تقدیر کے فیصلے اہل ہند نہیں، بلکہ انگریز کریں گے۔ ۱۷۵۷ء سے لے کر ۱۸۵۷ء تک مسلسل سو سال تک اہل ہند اور غیر ملکی طالع آزما کمپنی میں جنگ جاری رہی، جو بالآخر ۱۸۵۷ء میں اہل ہند کی باہمی کشمکش، کوتاہ نظری، ناقص منصوبہ بندی اور انگریزی فوج کی بہتر تنظیم کی وجہ سے بری طرح ناکام ہوگئی۔ اس مدت میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جنوبی ہند نے حیدر علی اور سلطان ٹیپو جیسے زیرک، بہادر اور صاحب نظر رہنماؤں کو جنم دیا۔ حیدر علی کی سیاسی بصیرت نے انگریزی خطرے کو بھانپ لیا تھا۔ اس خطرے سے نپٹنے کے لیے اس نے نہ صرف مرہٹوں اور نظام کو متحدہ محاذ بنانے کی دعوت دی بلکہ بحری طاقت بننے کی بھی کوشش کی، اس کے بیٹے سلطان ٹیپو نے ایک نئے ولولے اور جذبے سے فیصلہ کن جنگ کا فیصلہ کیا۔ لیکن افسوس! چند ملت فروشوں کے ہاتھوں میدان ہار گئے، لیکن ذلت و رسوائی کی زندگی پر باوقار جنازہ اٹھنے کو ترجیح دی اور آنے والی نسلوں کے لیے ایک روشن مثال قائم کی۔

۱۸۵۷ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک اہل ہند نے آزادی وطن کے لیے بڑی قربانیاں دیں اور اس راہ میں ہر مصیبت کو خوش آمدید کہا، دار و رسن کو آزمائش میں ڈالا اور پروانوں کی طرح شمع آزادی پر اپنے آپ کو نچھاور کیا۔ دانش وروں، فلسفیوں، قلم کاروں، صحافیوں، سیاست دانوں، مدبروں اور علماء نے اس تحریک آزادی میں اپنا اپنا کردار ادا کیا۔ جن ممتاز سیاست دانوں نے اس تحریک کو منزل تک پہنچایا، ان میں مہاتما گاندھی اور قائداعظم محمد علی جناح سرفہرست ہیں۔ برصغیر کی موجودہ تاریخ کا یہ انوکھا واقعہ ہے کہ یہ دونوں رہنما۔ جو بالترتیب آل انڈیا نیشنل کانگریس اور آل انڈیا مسلم لیگ کی قیادت کر رہے تھے۔ برصغیر کی آزادی اور ہندو مسلم اتحاد کے قائل تھے اور تشدد، قتل و غارت اور خون ریزی کے سخت مخالف، لیکن ۱۹۴۷ء میں برصغیر کے آخری وائسرائے لارڈ مونٹ بیٹن نے انتقال اقتدار میں غیرذمہ دارانہ رویہ اختیار کیا، جس کی وجہ سے پنجاب اور بنگال کی تقسیم میں متفقہ فارمولے کو ترک کر دیا گیا اور پنجاب کے ان علاقوں کو پاکستان سے باہر رکھا گیا، جن کا تعلق مسلم اکثریت سے تھا۔ افسوس! یہ "گھناؤنا جرم" ماؤنٹ بیٹن کے ایماء پر ایک جج نے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سرانجام دیا اور جب پنجاب کی بعض فسطائی طاقتوں نے صوبے کے امن و امان کو تباہ کرنے کے لیے تلوار کا سہارا لیا تو وائسرائے بعض قومی رہنماؤں کے انتباہ کے باوجود ایک خاموش تماشائی کی حیثیت سے قتل و غارت کا نظارہ کرتے رہے۔ انسانی بستیاں ویران ہوگئیں‘ لاکھوں انسان بڑی بے رحمی سے قتل کر دیے گئے‘ ڈیڑھ کروڑ انسان اپنے گھروں سے باہر نکال دیئے گئے‘ اور پنجاب کی سرزمین میں فطرت کے عطا کردہ پانچ دریاؤں کے ساتھ ساتھ انسانی درندگی کے تیار کردہ خونی دریا بھی بہنے لگے۔ ان ہول ناک فسادات کے نتیجے میں مشرقی پنجاب کی پوری مسلم آبادی انتہائی بے بسی کے عالم میں ایک لمبی اور روح فرسا مسافت طے کر کے پاکستان کے حدود میں داخل ہوئی اور ردعمل میں یہی المیہ مغربی پنجاب میں بھی دہرایا گیا‘ اور یوں ایک ہزار سالہ مسلم ثقافت و تاریخ اور مشترکہ کلچر کو ستلج اور بیاس کی خونی لہروں میں ڈبو دیا گیا۔ یاد رہے کہ اس گھر کو گھر ہی کے چراغ سے آگ لگی اور انگریز صحیح و سالم تماشا دیکھتے رہے۔

جب ۱۹۴۷ء میں برصغیر کے نقشے پر پاکستان ایک آزاد مسلم ریاست کے نام سے وجود میں آیا تو مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم نے کہا کہ اورنگ زیب عالم گیر کے بعد محمد علی جناح پہلے مسلم مدبر ہیں جن کے ہاتھوں ایک آزاد مسلم ریاست وجود میں آئی ہے۔

قیام پاکستان سے پہلے علامہ اقبال اور قائداعظم محمد علی جناح نے مسلم اکثریت کے علاقوں سے متعلق جن سیاسی خیالات کا اظہار کیا تھا‘ ان کے مطابق یہ کہنا جائز ہوگا:۔

۱۔ پاکستان ایک فلاحی جمہوری ریاست ہوگی‘ جہاں ملک کے ہر شہری کو سیاسی‘ معاشی‘ مذہبی اور ثقافتی مکمل حقوق حاصل ہوں گے۔

۲۔ اسلام کے بلند اصولوں‘ عدل و انصاف‘ مساوات اور اخوت کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بنیادوں پر ایک ایسے جدید معاشرے کی تشکیل کی جائے گی، جس میں ہر شہری اپنے روحانی اور ثقافتی روایات کے مطابق اپنی انفرادی اور اجتماعی شخصیت کی نشوونما کر سکے گا۔

۳۔ ملک کا سیاسی نظام جمہوری ہوگا، جس میں ملوکیت، جاگیرداری، سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت کے لیے کوئی جگہ نہیں ہوگی۔ یہ جمہوری نظام اقبال کی زبان میں "روحانی جمہوریت" ہوگا۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اس جمہوری نظام کا دامن میکیاولی سیاست کے ہر داغ سے پاک ہوگا۔ سیاست کے بنیادی مزاج "فساد" کی اصلاح بلند اخلاقی قدروں سے کی جائے گی۔ اسی "مزاج" کی بنا پر شیکسپئر کے ایک کردار میں کہا گیا ہے، کہ "میں سیاست سے نفرت کرتا ہوں" اس نفرت کی وجہ یہی "میکیاولی سیاست" ہے، جس کی وجہ سے غریب دہقان اور مزدور ہمیشہ طالع آزما سیاست دانوں سے مات کھاتا رہا ہے۔

۴۔ بانی پاکستان نے قیام پاکستان کے بعد سٹیٹ بنک کی ایک پروقار تقریب میں کہا تھا کہ مغرب کے موجودہ اقتصادی نظام نے انسان پر دو خوف ناک جنگوں کو مسلط کیا ہے۔ اس لیے یہ نظام ہمارے لیے قطعاً سود مند نہیں ہے، ہمیں اپنی بلند روایات کی روشنی میں خود ہی ایک منصفانہ نظام وضع کرنا ہوگا۔ چنانچہ انہوں نے حکومت برطانیہ سے پاکستانی دستور کی تدوین کے لیے برطانوی ماہرین دستور کی خدمات کو مستعار لینا چاہا، تاکہ اس جدید دور میں ہر شہری کے حقوق کا مکمل تحفظ کیا جا سکے۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا اہل پاکستان نے اقبال و جناح کے افکار کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

روشنی میں اپنے ہاں جمہوری نظام قائم کیا؟ کیا عوام الناس کو جنھوں نے تحریک آزادی میں ایک باوقار زندگی بسر کرنے کے لیے تن من کی قربانی دی تھی' ایک باوقار زندگی بسر کرنے کے مواقع فراہم کیے گئے؟ کیا انہیں ان کے سیاسی' معاشی اور قانونی حقوق ملے؟ کیا ہمارے معاشرے کو "میکیاولی سیاست" اور جاگیردارانہ کلچر سے جسے برطانوی راج نے پروان چڑھایا تھا' نجات ملی؟

ہماری تاریخ نے ہمیں بتایا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے خلیفہ بننے کے بعد اپنی پہلی تقریر میں فرمایا:۔ "لوگو! ہرچند میں تم میں سے بہتر آدمی نہیں ہوں' لیکن مجھے آپ کا حکمران بنا دیا گیا ہے' پس! اگر تم مجھے سچائی کے ساتھ پاؤ' تو میری مدد کرو' اور اگر باطل کے ساتھ دیکھو تو مجھے سیدھی راہ پر لگاؤ (یاد رکھو تم میں سب سے طاقت ور آدمی میری نگاہ میں سب سے زیادہ کمزور ہے۔ تا آں کہ میں اس سے "حق" (جو اس نے غصب کر رکھا ہے) چھین لوں' اور تمہاری صفوں میں سب سے بےبس آدمی میری نگاہ میں سب سے زیادہ طاقت ور ہے' تا آں کہ اس کے ساتھ کیے گئے ظلم کا تدارک کر دوں۔"

حضرت ابوبکرؓ نے اپنی اس معروف تقریر میں یہ بتا دیا کہ ریاست کا بنیادی فریضہ یہ ہے کہ جو لوگ اپنے حقوق کا تحفظ نہیں کر سکتے' ریاست ان کا تحفظ کرے گی۔

نہایت ہی دکھ کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس پچاس سال میں ہمارے معاشرے میں نہ صرف غریب عوام کے حقوق کا تحفظ نہیں کیا گیا' بلکہ حکومتوں کی مسلسل غلط معاشی روش سے مہنگائی اس حد تک بڑھی کہ غریب تڑپ تڑپ اٹھے اور تقریباً تین کروڑ انسان آج بھی خط غربت سے نیچے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ جہاں تک ہماری "سیاسی بصیرت" کا تعلق ہے' اس کی ناکامی پر کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں' بنگلہ دیش کا وجود۔ جو کل تک متحدہ پاکستان کا حصہ تھا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہماری سیاسی ناکامی کی منہ بولتی تصویر ہے۔ ہماری ناکامیوں کی ایک لمبی داستان ہے، اس داستان کا ایک خوں چکاں باب یہ ہے کہ جس انگریزی سامراج سے نجات حاصل کرنے کے لیے سو سال تک مسلمانوں نے قربانیاں دیں تھیں، اسی سامراج کے تیار کردہ فوجی معاہدوں : معاہدۂ بغداد اور سیٹو میں ہم نے شرکت کی، اور چند سرکاری افسروں نے جو ملک کے سب سے بڑے قومی منصب پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہوگئے تھے، ۱۹۵۴ء میں پاکستان کے لیے برطانیہ کی جگہ ایک دوسرا ''آقا'' تلاش کرلیا، جو دوسری جنگ میں ایک عالمی طاقت کی حیثیت سے عالمی سیاست کے سٹیج پر آیا تھا۔ چنانچہ نئے آقا نے ہمیں آں جہانی سویت یونین کے خلاف برابر استعمال کیا، جس کے نتیجے میں کراچی سے خیبر تک کلاشنکوف کلچر نے جنم لیا اور افغانستان کی پوری آبادی آج بھی آگ کے دریا سے گزر رہی ہے۔ اس المیہ پر ہم اس کے سوا اور کیا کہہ سکتے ہیں :-

''بے دست و پا کو دیدۂ بینا نہ چاہیے''

ہم اس داستان کو طول دینا نہیں چاہتے، لیکن اختصار کے ساتھ یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے، کہ اس نصف صدی میں وقت نے ہمارے سامنے جو سلوک کیا، ہم نے اس سے کوئی سبق نہیں سیکھا، اور نہ ہی دیانت، محنت، خدا اور عوام کے سامنے جواب دہی کے گہرے شعور سے سرشار ہو کر اس پاک دھرتی کو امن و آشتی اور خوش حالی کی سرزمین بنانے کے لیے کوئی کام کیا۔ چنانچہ ہم نے سیاست، معیشت، تعلیم، قانون اور اخلاق کے میدان میں کوئی ایسا مثبت کارنامہ انجام نہیں دیا، جس پر ہم اپنے ضمیر کی عدالت میں سربلند کر کے فخر سے یہ کہہ سکیں کہ ہم نے اس ملک کے غریب عوام کے لیے کوئی کام کیا ہے۔

تعلیم میں ہماری پس ماندگی کا حال یہ ہے کہ آج ہم پورے جنوبی ایشیا میں سب سے پیچھے کھڑے ہیں۔ ایک دو یونیورسٹیوں اور سائنسی اداروں کو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

چھوڑ کر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہماری دانش گاہیں علم و تربیت اور سائنس و ٹیکنالوجی کے عصری تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے اپنا کردار نہیں کرپائیں۔

معیشت میں ہم تباہی کے دھانے پر کھڑے ہیں۔ ۱۹۹۶ء، ۱۹۹۷ء کے بارے میں سٹیٹ بنک نے جو رپورٹ جاری کی ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ ہماری زرعی، تجارتی اور صنعتی پیداوار میں کس حد تک کمی واقع ہوئی ہے۔ ادھر ۱۹۹۴ء سے پوری قوم اس امر سے واقف ہے کہ بعض بااثر سیاست دانوں اور صنعت کاروں نے بنکوں سے اربوں روپے کے قرضے لے کر ہضم کر لیے ہیں، لیکن ابھی تک یہ پتہ نہیں چلا کہ دو ایک آدمیوں کے علاوہ کن کے خلاف کوئی قانونی کارروائی ہوئی ہے، یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ رشوت، سفارش، بدنظمی اور اخلاقی بے حسی نے معاشرے میں اس حد تک "طاقت" حاصل کر لی ہے کہ حکومت اور معاشرے کے اصلاح پسند حلقے بھی اس کے سامنے بے بس ہیں اور ملک کے عام لوگ ایک مسیحا کا انتظار کر رہے ہیں!!

جہاں تک سیاست کا تعلق ہے تو اب یہ راز راز نہیں رہا، کہ اس نصف صدی میں تقریباً ۲۵ سال قوم کو مارشل لاء کی تاریکیوں میں بھٹکنا پڑا، اور باقی مدت میں وہ ہنگاموں، نعروں، مظاہروں اور توڑ پھوڑ کی سیاست کا تماشا دیکھتی رہی۔ ہماری سیاسی تاریخ کا یہ انوکھا واقعہ بھی اپنے اندر چشم بینا کے لیے عبرت و موعظت کا ساماں رکھتا ہے کہ مرحوم صدر چوہدری فضل الٰہی کے سوا کوئی صدر ایوان صدارت میں اپنی مدت قیام پورا نہیں کرسکا، اور نہ ہی کسی وزیراعظم کو اپنی آئینی مدت پورا کرنے کی اجازت دی گئی۔ صحیح بات یہ ہے کہ مصر میں مرحوم جمال عبدالناصر کے فوجی انقلاب ۱۹۵۲ء سے پہلے وزارتوں کا بننا اور گرنا قاہرہ میں برطانوی سفیر کے اشاروں پر ہوتا تھا اور شاہ فاروق کی حیثیت ایک "پتلی" کے سوا کچھ نہ تھی، یہی کچھ حال آج ہماری "شب گزیدہ سحر" کا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے، ہماری قسمت کے فیصلے ہماری دھرتی پر نہیں ''آسمان'' پر ہوتے ہیں۔ اب اگر ہماری زراعت یا معیشت جاگیرداروں اور صنعت کاروں کے ہاتھوں جاں بلب ہے، تو یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں، ۱۹۵۹ اور ۱۹۷۲ء کی زرعی اصلاحات اگر کسی خدا ترس مدبر اور سیاست دان کے ہاتھوں نافذ کی جاتیں، تو یقیناً ناکام نہ ہوتیں۔

(تفصیل کے لیے دیکھیے: ڈاکٹر محبوب الحق: جنوبی ایشیا میں انسانی ترقی، ۱۹۹۷ء)

ستم پہ ستم یہ ہوا کہ ہماری سیاسی انا نے سادگی، قناعت اور اخلاقی ذمہ داری کو اپنانے کی بجائے باہر سے سامان تعیش کو درآمد کرنے کی پالیسی اختیار کی۔ جس میں سرفہرست نفیس اور قیمتی کاروں کو ملک میں آنے کی اجازت دی گئی۔ چنانچہ دیکھتے ہی دیکھتے کراچی سے خیبر تک کاروں کا سیلاب آگیا اور وہ ہمارے سوشل سٹیٹس (Social Status) کی علامت بن گئیں۔ لیکن اس کے لیے ہم نے بھاری قیمت ادا کی۔ گزشتہ پچاس سال میں موجودہ حکومت شاید پہلی حکومت ہے، جس نے صدر، وزیر اعظم یا چیف آف سٹاف کے لیے ''ٹیکس معاف'' کار کی اجازت کو ختم کر دیا ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ وہ یہ قدم بھی اٹھاتی کہ آج سے ملک میں ملکی کاروں کو ہی استعمال میں لایا جائے گا اور باہر سے کوئی کار ملک میں نہیں آئے گی۔

ہمارے پڑوسی ملک میں باہر کی کوئی کار نظر نہیں آتی، وہاں کا صدر اور وزیر اعظم ملکی کار ہی میں۔ جس کی قیمت ڈیڑھ یا دو لاکھ سے زیادہ نہیں، چلتا ہے، جب کہ ہمارے صدر محترم یا وزیر اعظم ۸۰ر لاکھ کی غیر ملکی کار میں جلوہ افروز ہوتے ہیں۔ یہاں یہ بات بھی شاید تعجب سے سنی جائے گی کہ ہمارے صدر ہاؤس کا روزانہ خرچ ۳۵ لاکھ روپے ہے، کہا جاتا ہے کہ سنگاپور کے وزیر اعظم امریکہ گئے، تو انھوں نے ۱۷ سو ڈالر یومیہ پر ہوٹل میں قیام کیا، جب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کہ ہمارے ایک سابق وزیراعظم امریکہ گئے' تو انہوں نے ۳۶ سو ڈالر یومیہ ہوٹل کو ادا کیے۔ یہ بات محتاج بیاں نہیں' معاشی اعتبار سے پاکستان سنگاپور سے کہیں پیچھے ہے۔ البتہ نام و نمود' بد نظمی اور کرپشن میں سنگاپور کا ہم سے کوئی مقابلہ نہیں۔

القصہ جب سیاسی اور اقتصادی طور پر جنوب ایشیا میں ہم نے کوئی کام نہ کیا ہو' اور نہ ہی عام شہری کو جان' مال' ناموس اور دین کا تحفظ حاصل ہو' اس صورت حال کا فطری تقاضا یہ تھا کہ ہم پچاس سالہ جشن نہ مناتے اور کسی سرکاری یا غیر سرکاری تقریب پر ایک پائی تک خرچ نہ کرتے۔ بلکہ پے بہ پے ٹھوکریں کھانے پر صف ماتم بچھاتے اور سچے دل سے خدا اور قوم کی طرف رجوع کرتے اور سیاسی اور اقتصادی صورت حال کو بہتر بنانے اور کرپشن پر قابو پانے کے لیے اپنا کڑا محاسبہ کرنے کے لیے ایک احتسابی کمیشن بناتے' جس میں حزب اقتدار' حزب اختلاف کے ممبروں کے علاوہ دانشور اور ملک کے ماہرین فن بھی شریک ہوتے۔ کمیشن کی سفارشات پر اسمبلی میں بحث ہوتی اور قوم کو پتہ چلتا کہ حکومت اور حزب اختلاف پوری سنجیدگی سے اجتماعی حالات پر نگاہ رکھے ہوئے ہیں۔ افسوس! ۱۴ر اگست ۱۹۹۷ء کو کوئی ایسی بات دیکھنے میں نہیں آئی' البتہ خلافت راشدہ' اقبال اور جناح کے نقش قدم پر چلنے کے نعرے پہلے کی طرح فضا میں ضرور گونجتے رہے۔ اپنے انفرادی اور اجتماعی کردار میں بنیادی تبدیلی لائے بغیر ہمیں ایسے نعروں پر کبھی تو سوچنا چاہیے!!

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے؟ غالب!
شرم تم کو مگر نہیں آتی!

چنانچہ ارباب اقتدار' ارباب دانش اور اصحاب نظر سے یہ امید کی جاتی ہے کہ وہ قومی اور عالمی تناظر میں اپنے ملک اور معاشرے کا جائزہ لیں اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قومی و ملی روایات اور روح عصر میں ڈوب کر اپنے لیے لائحہ عمل تیار کریں۔
بے شبہ اس نصف صدی میں روا رکھی جانے والی غفلتوں، ناکامیوں اور کوتاہیوں کا ازالہ کر کے ہی ہم قوم کو روشن مستقبل کی خبر دے سکتے ہیں۔
قرآن مجید میں آیا ہے کہ:

"جو لوگ ہماری راہ میں جدوجہد سے کام لیتے ہیں، ہم ان کے سامنے (ادراک حقیقت کے لیے) نئی نئی راہوں کو کھول دیتے ہیں۔" (العنکبوت)

رشید احمدؒ (جالندھری)

© rasailojaraid.com